ہل اسٹیشن

ان دنوں مرزا کے اعصاب پر ہل اسٹیشن بُری طرح سوار تھا۔ لیکن ہمارا حال ان سے بھی زیادہ خستہ تھا۔ اس لیے کہ ہم پر مرزا اپنے متاثرہ اعصاب اور ہل اسٹیشن سمیت سوار تھے جان ضیق میں تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اِسی کا ذِکر، اسی کا وِرد۔ ہُوا یہ کہ وہ سرکاری خرچ پر دو دِن کے لیے کوئٹہ ہو آئے تھے اور اب اس پر مچلے تھے کہ ہم بلا تنخواہ رخصت پر اُن کے ساتھ دو مہینے وہاں گزار آئیں، جیسا کہ گرمیوں میں شُرفا و عمائدینِ کراچی کا دستور ہے۔ ہم نے کہا، سچ پُوچھو تو ہم اسی لیے وہاں نہیں جانا چاہتے کہ جن لوگوں کے سائے سے ہم کراچی میں سال بھر بچتے پھرتے ہیں، وہ سب مئی جون میں وہاں جمع ہو جاتے ہیں۔ بولے، ٹھیک کہتے ہو۔ مگر بندۂ خدا! اپنی صحّت تو دیکھو۔ تمھیں اپنے بال بچّوں پر ترس نہیں آتا؟ کب تک حکیم ڈاکٹروں کا پیٹ پالتے رہو گے؟ وہاں پہنچتے ہی بغیر دوا کے چاق چوبند ہو جاؤ گے۔ پانی میں دوا کی تاثیر ہے اور (مُسکراتے ہُوئے) کسی کسی دن مزا بھی ویسا ہی۔ یُوں بھی جو وقت پہاڑ پر گزرے، عُمر سے مِنہا نہیں کیا جاتا۔ مکھّی مچھّر کا نام نہیں۔ کیچڑ ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ اِس لیے کہ پانی کی سخت قِلّت ہے۔ لوگوں کی تندرستی کا حال تمھیں کیا بتاؤں۔ جسے دیکھو، گالوں سے گلابی رنگ ٹپکا پڑ رہا ہے۔ ابھی پچھلے سال وہاں ایک وزیر نے اسپتال کا اِفتتاح کیا تو تین دن پہلے ایک مریض کو کراچی سے بلوانا پڑا اور اس کی نگرانی پر چار بڑے ڈاکٹر تعیّنات کیے گئے، کہ

کہیں وہ رسمِ افتتاح سے پہلے ہی صحّت یاب نہ ہو جائے۔ ہم نے کہا، اب وہ ہوا اپنی جگہ، مگر ہم دوا کے بغیر اپنے تئیں نارمل محسوس نہیں کرتے۔ بولے، اس کی فکر نہ کرو کوئٹہ میں آنکھ بند کر کے کسی بھی بازار میں نکل جاؤ۔ ہر تیسری دُکان دواؤں کی ملے گی اور ہر دوسری دُکان تنوری روٹیوں کی۔ پُوچھا، اور پہلی دُکان؟ بولے، اس میں ان دُکانوں کے لیے سائن بورڈ تیار کیے جاتے ہیں۔ ہم نے کہا لیکن کراچی کی طرح وہاں قدم قدم پر ڈاکٹر کہاں؟ آج کل تو بغیر ڈاکٹر کی مدد کے آدمی مر بھی نہیں سکتا۔ کہنے لگے، چھوڑو بھی! فرضی بیماریوں کے لیے تو یونانی دوائیں تیر بہدف ہوتی ہیں۔

ہمارے بے جا شکوک اور غلط فہمیوں کا اِس مدلّل طریقے سے ازالہ کرنے کے بعد انھوں نے اپنا وکیلوں کا سا لب و لہجہ چھوڑا اور بڑی گرم جوشی سے ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر "ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں" والے انداز میں کہا "بھئی! اب تمھارا شمار بھی حیثیّت داروں میں ہونے لگا۔ جبھی تو بنک کو پانچ ہزار قرض دینے میں ذرا پس و پیش نہ ہوا۔ واللہ! مَیں حسد نہیں کرتا۔ خُدا جلد تمھاری حیثیّت میں اِتنی ترقّی دے کہ پچاس ہزار تک مقروض ہو سکو۔ میں اپنی جگہ صِرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ اب تمھیں اپنے انکم بریکٹ★ والوں کی طرح گرمیاں گزارنے ہِل اسٹیشن جانا چاہیے۔ یہ نہیں تو کم از کم چھٹی لے کر گھر ہی بیٹھ جایا کرو۔ تمھارا یُوں کھُلے عام سڑکوں پر پھرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ میری سُنو ۱۹۵۶ء کی بات ہے۔ گرمیوں میں کچھ یہی دن تھے۔ میری بڑی بچّی اسکُول سے لَوٹی تو بہت روہانسی تھی۔ کریدنے پر پتہ چلا اس کی ایک سہیلی نے جو وادیِ سوات جا رہی تھی، طعنہ دیا کہ کیا تم لوگ نادار ہو، جو سال بھر اپنے ہی گھر میں رہتے ہو۔ صاحب! وہ دِن ہے اور آج کا دِن، میں تو ہر سال مئی جون میں چھٹی

★ انکم بریکٹ۔ مساوی آمدنی والوں کا طبقہ۔

لے کر مع اہل و عیال "انڈر گراؤنڈ" ہو جاتا ہوں"۔ پھر انھوں نے کراچی کے اور بھی بہت سے زیں دوز شرفاء کے نام بتائے جو انہی کی طرح سال کے سال اپنی عزّت و ناموس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اپنا یہ وار کارگر ہوتا دیکھا تو "ناک آؤٹ" ضرب لگائی۔ فرمایا "تم جو ادھر دس سال سے زحمت پر نہیں گئے تو لوگوں کو خیال ہو چلا ہے کہ تم اس ڈر کے مارے نہیں کھسکتے کہ دفتر والوں کو کہیں یہ پتہ نہ چل جائے کہ تمھارے بغیر بھی بخوبی کام چل سکتا ہے"۔

قصّہ حاتم طائی میں ایک طلسماتی پہاڑ کا ذکر آتا ہے۔ کوہ ندا اس کا نام ہے اور یہ نام یوں پڑا کہ قلّہ کوہ سے ایک عجیب و غریب آواز آتی ہے کہ جس کسی کو یہ سنائی دے، وہ جس حالت میں، جہاں بھی ہو، بے اختیار اسی کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ پھر دنیا کی کوئی طاقت، کوئی رشتہ ناتا، کوئی بندھن اسے روک نہیں سکتا۔ اب لوگ اسے قصّہ کہانی سمجھ کر مسکرا دیتے ہیں، حالانکہ سننے والوں نے سنا ہے کہ ایسی آواز اب ہر سال ہر پہاڑ سے آنے لگی ہے۔ مرزا کا کہنا ہے کہ یہ آواز جب تمھیں پہلے پہل سنائی دے تو اپنی مفلسی کو اپنے اور پہاڑ کے درمیان حائل نہ ہونے دو۔ لہٰذا طے پایا کہ صحّت اور غیرت کا یہی تقاضا ہے کہ ہل اسٹیشن چلا جائے۔ خواہ مزید قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ ہم نے دبے لہجے میں یاد دلایا کہ قرض مقراض محبّت ہے۔ مرزا بولے، دیکھتے نہیں، لوگ اس مقراض کو کیسی چابکدستی سے استعمال کر کے اپنی مشکلات دوسروں کو منتقل کر دیتے ہیں؟ صاحب! ہنرمند کے ہاتھ میں اوزار بھی ہتھیار بن جاتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت غالباً بے محل نہ ہوگی کہ قرض کے باب میں مرزا کا پندرہ بیس سال سے وہی عقیدہ ہے جو مولینا حالی کا علم و ہنر کے بارے میں تھا یعنی ہر طرح سے حاصل کرنا چاہیے

جس سے ملے، جہاں سے ملے، جس قدر ملے

لیکن ہم نے اتنی شرط ضرور لگادی کہ پروفیسر قاضی عبدالقدوس ساتھ ہوں گے تو ذرا دل لگی رہے گی اور ضرغوص بھی ساتھ چلیں گے۔ بلکہ ہم سب انہی کی چمچماتی بیوک کار میں چلیں گے۔

پروفیسر قاضی عبدالقدوس ظریف نہ سہی، ظرافت کے مواقع ضرور فراہم کرتے رہتے ہیں۔ مگر انھیں ساتھ گھسیٹنے میں تفنّنِ طبع کے علاوہ ان کی دُنیا و عاقبت سنوارنے کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔ وہ یُوں کہ قصبہ چاکسُو سے کراچی وارد ہونے کے بعد وہ پندرہ سال سے ریل میں نہیں بیٹھے تھے اور اب یہ عالم ہو گیا تھا کہ کبھی میونسپل حدود سے باہر قدم پڑ جائے تو اپنے کو غریب الوطن محسُوس کرنے لگتے۔ آخر کس باپ کے بیٹے ہیں۔ ان کے والدِ بزرگوار مرتے مر گئے، مگر فرنگی کی ریل میں نہیں بیٹھے اور آخر دم تک اس عقیدے پر بڑے استقلال سے قائم رہے کہ دُوسرے قصبوں میں چاند اتنا بڑا ہو ہی نہیں سکتا جتنا کہ چاکسُو میں۔ مناظرِ قدرت کے شیدائی ہیں۔ خصُوصاً دریائے سندھ کے۔ کہتے ہیں، خُدا کی قسم! اِس سے خوبصورت دریا نہیں دیکھا۔ وہ قسم نہ کھائیں تب بھی یہ دعویٰ حرف بحرف صحیح ہے۔ اِس لیے کہ انھوں نے واقعی کوئی اور دریا نہیں دیکھا۔ خُدا جانے کب سے اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ بس ٹوکنے کی دیر تھی۔ کہنے لگے، ضرُور چلوں گا۔ کراچی تو نرا ریگستان ہے۔ بارش کا نام نہیں۔ دو سال سے کان پرنالے کی آواز کو ترس گئے ہیں۔ میں تو ساون بھادوں میں رات کو غسل خانے کا نل کھُلا چھوڑ کر سوتا ہُوں تاکہ خواب میں ٹپ ٹپ کی آواز آتی رہے۔ مرزا نے ٹوکا کہ کوئٹہ میں بھی برسات میں بارش نہیں ہوتی۔ پُوچھا، کیا مطلب؟ بولے، جاڑے میں ہوتی ہے۔

تاہم "پاک بوہیمین کافی ہاؤس" میں کئی دن تک قیاس آرائیاں ہوتی رہیں کہ پروفیسر قدوس ساتھ چلنے کے لیے اتنی جلدی کیسے آمادہ ہو گئے اور کوئٹہ کا نام سُنتے ہی

ملتان کی کوری صراحی کی طرح کیوں سنسنانے لگے۔ مرزا نے کچھ اور ہی تاویل کی۔ فرمایا، قصّہ دراصل یہ ہے کہ پروفیسر کے ایک دوست ان کے لیے پیرس سے سمور کے دستانے تحفۃً لائے ہیں، جنھیں پہننے کے چاؤ میں وہ جلد از جلد کسی ہل اسٹیشن جانا چاہتے ہیں کیونکہ کراچی میں تو لوگ دسمبر میں بھی ململ کے کُرتے پہن کر آئس کریم کھانے نکلتے ہیں۔ اس حُسنِ تعلیل کی تصدیق ایک حد تک اس سُوٹ کیس سے بھی ہُوئی جس میں پروفیسر یہ دستانے رکھ کر رکھ گئے تھے۔ اس پر یورپ کے ہوٹلوں کے رنگ برنگے لیبل چپکے ہُوئے تھے۔ وُہ اسے کبھی جھاڑتے پُونچھتے نہیں تھے کہ کہیں وہ اُتر نہ جائیں۔

اب رہے ضرغوص۔ تو رسمی تعارف کے لیے اِتنا کافی ہوگا کہ پُورا نام ضرغامُ الاسلام صدّیقی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی سینیئر ایڈووکیٹ ہے۔ ہمارے یُونیورسٹی کے ساتھی ہیں۔ اُس زمانے میں لڑکے بر بنائے اخلاص و اختصار انھیں "ضرغوص" کہتے تھے۔ ان مخلص حلقوں میں آج بھی اسی مخفّف نام سے پُکارے اور یاد کیے جاتے ہیں۔ اکثر ناواقف اعتراض کر بیٹھتے ہیں، بھلا یہ بھی کوئی نام ہُوا۔ لیکن ایک دفعہ انھیں دیکھ لیں تو کہتے ہیں، ٹھیک ہی ہے۔ پروفیسر نے ان کی شخصیّت کا تجزیہ بلکہ پوسٹ مارٹم کرتے ہُوئے ایک دفعہ بڑے مزے کی بات کہی۔ فرمایا، ان کی شخصیّت میں سے "بنک بیلنس" اور "بیوک" نکال دیں تو باقی کیا رہ جاتا ہے؟ مرزا نے جھٹ سے لُقمہ دیا، ایک بدنصیب بیوی — ! سیر دسیاحت کے رسیا، لیکن ذرا کُھرچ کر دیکھیے تو اندر سے ٹھیٹ شہری۔ ایسا شہری جو بڑی محنت، بڑی مشقّت سے جنگلوں کو ختم کر کے شہر آباد کرتا ہے اور جب شہر آباد ہو جاتے ہیں تو پھر جنگلوں کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔ بڑے وضعدار آدمی ہیں اور اس قبیلے سے ہیں جو پھانسی کے تختے پر چڑھنے سے پہلے اپنی ٹائی کی گرہ درست کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

زیادہ تر کار سے سفر کرتے ہیں اور اسے بھی کمرۂ عدالت تصوّر کرتے ہیں۔ چنانچہ کراچی سے اگر کابُل جانا ہو تو اپنے محلّے کے چوراہے سے ہی درّۂ خیبر کا راستہ پُوچھنے لگیں گے۔ دو سال پہلے مرزا ان کے ہمراہ مری اور وادیِ کاغان کی سیر کر آئے تھے اور ان کا بیان ہے کہ کراچی میونسپل کارپوریشن کے حدود سے نکلنے سے پہلے ہی وہ پاکستان کا "روڈ میپ" (سڑکوں کا نقشہ) سیٹ پر پھیلا کر بغور دیکھنے لگے۔ مرزا نے کہا تمھیں بغیر نقشہ دیکھے بھی یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کراچی سے نکلنے کی ایک ہی سڑک ہے۔ بقیہ تین طرف سمندر ہے۔ بولے، اسی لیے تو سارا تردّد ہے۔

اسی سفر کی یادگار ایک تصویر تھی جو ضرغوص نے کوہِ شوگراں پر ایک نیشن یافتہ ٹٹّو پر بحالتِ رکوع کھنچوائی تھی۔ اِس تصویر میں وہ دُم کے علاوہ ٹٹّو کی ہر چیز پر سوار نظر آتے تھے لگام اِتنے زور سے کھینچ رکھّی تھی کہ ٹٹّو کے کان ان کے کانوں کو چُھو رہے تھے۔ اور چاروں کانوں کے بیچ میں ٹٹّو کی گردن پر اُن کی سہ منزلہ ٹھوڑی کی قلم لگی ہوئی تھی۔ اپنا سارا وزن رکاب پر ڈالے ہُوئے تھے تاکہ ٹٹّو پر بوجھ نہ پڑے۔ مرزا کہتے ہیں کہ کھڑی چڑھائی کے دَوران کئی مرتبہ ایسا ہُوا کہ ٹٹّو کمر لچکا کر رانوں کے نیچے سے سٹک گیا اور ضرغوص کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ دُشوار گزار ڈھلوانوں پر جہاں پگڈنڈی تنگ اور دائیں بائیں ہزاروں فٹ گہرے کھڈ ہوتے، وہاں وہ خود ٹانگیں سیدھی کر کے کھڑے رہ جاتے۔ کہتے تھے، اگر مقدّر میں گر کر ہی مرنا لکھّا ہے تو میں اپنی ٹانگوں کی لغزش سے مرنا پسند کروں گا، ٹٹّو کی نہیں۔ یہ تصویر تین چار ہفتے تک ان کے دفتر میں "رش" لیتی رہی۔ بعد ازاں دُوسرے وکیلوں نے سمجھا بجھا کر اُتروا دی کہ انجمنِ انسدادِ بے رحمیِ جانوران والوں میں سے کسی نے دیکھ لی تو کھٹاک سے تمھارا چالان کر دیں گے۔

(۲)

چار درویشوں کا یہ قافلہ کار سے روانہ ہُوا۔ ریگستان کا سفر اور لُو کا یہ عالم کہ پسینہ نکلنے سے پہلے خشک۔ جیکب آباد سے آگے بڑھے تو مرزا کو بڑی شدّت سے چنوں کی کمی محسوس ہونے لگی۔ اس لیے کہ اگر وہ پاس ہوتے تو ریت میں بڑے خستہ بھُونے جا سکتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد اُنھوں نے صُراحی میں پتّی ڈال کر چائے بنانے کی تجویز پیش کی جو بلا شکریہ اس لیے رد کر دی گئی کہ سڑک سے دھواں سا اُٹھ رہا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ضرغوص کو یہی گرم پانی گرم ترٹائروں پر چھڑکنا پڑتا تھا۔ ۱۲۰ درجہ گرمی سے پگھلے ہُوئے تارکول کی چھینٹیں اُڑ اُڑ کر کار کے شیشے کو داغدار کر رہی تھیں۔ اِس چھلنی میں سے جھانکتے ہُوتے ہم نے اُنگلی کے اِشارے سے پروفیسر کو سات آٹھ سال کی بلوچ لڑکی دکھائی جو سر پر خالی گھڑا رکھے، سڑک پر ننگے پاؤں چلی جا رہی تھی۔ جیسے ہی اُس پر نظر پڑی، پروفیسر نے برف کی ڈلی جو وُہ چُوس رہے تھے، فوراً تھوک دی۔ اِس پر ضرغوص کہنے لگے کہ وُہ ایک دفعہ جنوری میں کراچی سے برف باری کا منظر دیکھنے گئے تو مری کے نواح میں برف پر پیروں کے نشان نظر آئے، جن میں خُون جما ہُوا تھا۔ ہوٹل گائیڈ نے بتایا کہ یہ پہاڑیوں اور ان کے بچّوں کے پیروں کے نشان ہیں۔ پروفیسر کے چہرے پر درد کی لہر دیکھ کر ضرغوص تسلّی دینے لگے کہ یہ لوگ تو "لینڈ اسکیپ" ہی کا حصّہ ہوتے ہیں۔ اِن میں احساس نہیں ہوتا۔ پروفیسر نے کہا، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہارن بجاتے ہُوئے بولے، اِحساس ہوتا تو ننگے پاؤں کیوں چلتے؟

راستے کی رُوداد جو راستے ہی کی طرح طویل اور دلچسپ ہے، ہم علیٰحدہ رپورتاژ کے لیے اُٹھا رکھتے ہیں کہ ہر سنگِ میل سے ایک یادگار حماقت وابستہ ہے۔ سرِ دست اِتنا اشارہ کافی

ہوگا کہ پروفیسر اور مرزا کے لطفِ صحبت نے چھ سو میل کی مسافت اور تکان کو محسوس نہ ہونے دیا۔ پہاڑی راستوں کے اُتار چڑھاؤ پروفیسر کے لیے نئی چیز تھی۔ بطورِ خاص ہمیں مخاطب کرکے فرمایا، واللہ! یہ سڑک تو ہارٹ اٹیک کے کارڈیوگرام کی مانند ہے! ہر ناگہانی موڑ پر انھیں بیگم کی مانگ اُجڑتی دکھائی دیتی اور وہ مڑمڑ کے سڑک کو دیکھتے جو پہاڑ کے گرد سانپ کی طرح لپٹتی، بل کھاتی چلی گئی تھی۔ ضرغوص نے کار کو ایک سُرنگ میں سے پرو کر نکالا تو مرزا انگریز انجنیئروں کو یاد کرکے ایک دم جذباتی ہوگئے۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر کہنے لگے، یہ ہل اسٹیشن انگریز کی دین ہیں۔ یہ پہاڑ انگریز کی دریافت ہیں۔ پروفیسر قدّوس نے دائیں کنپٹی کھجاتے ہوئے فوراً تردید کی۔ فرمایا، تاریخ کہتی ہے کہ اِن پہاڑوں پر انگریزوں سے پہلے بھی لوگ رہتے تھے۔ مرزا نے کہا، بجا! مگر انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم پہاڑ پر رہ رہے ہیں! بالآخر نوک جھوک اور پہاڑوں کا سلسلہ ختم ہوا اور سانپ کے پھن پر ایک ہیرا دمکتا ہوا دکھائی دیا۔ "EUREKA ! EUREKA !"

شہر میں داخل ہوتے ہی ہم تو اپنے آپ کو مقامی آب و ہوا کے سپرد کرکے بے غم ہوگئے، لیکن مرزا کی باچھیں کانوں تک کھل گئیں اور ایسی کھلیں کہ دہانے میں تربوز کی قاش فٹ آجائے۔ سڑک کے دونوں طرف دیو قامت چنار دیکھ کر انھی کی طرح جھومنے لگے۔ بولے، اِس کو کہتے ہیں عالم آرائی۔ ایک پیڑ کے نیچے پوری برات سو جائے۔ یوں ہو کو لاہور میں بھی درخت ہیں۔ ایک سے ایک تناور، ایک سے ایک چھتنار۔ مگر جون جولائی میں پتّا تک نہیں ہلتا۔ معلوم ہوتا ہے، سانس روکے فوٹو کھنچوانے کھڑے ہیں۔ ہم بڑھ کر بولے، لیکن کراچی میں تو چوبیس گھنٹے فرحت بخش سمندری ہوا چلتی رہتی ہے۔ فرمایا، ہاں: کراچی میں پیپل کا پتّا بھی ہلنے لگے تو ہم اسے یکے از عجائباتِ قدرت جان کر میونسپل کارپوریشن

کا شکر ادا کرتے ہیں، جس نے یہ بیل بوٹے اُگائے۔ مگر یہاں اس "نیچرل بیوٹی" کی داد دینے والا کوئی نہیں۔ ہائے! یہ منظر تو بالکل "کرسمس کارڈ" کی طرح ہے!

ہم تینوں "یہ کرسمس کارڈ" دیکھنے کے بجائے پروفیسر کو دیکھ رہے تھے اور وہ "زندہ" درختوں کو انگلیوں سے چھو چھو کر اپنی نظر کی تصدیق کر رہے تھے۔ دراصل وہ خوبانیوں کو پھل والوں کی دکانوں میں رنگین کاغذوں اور گوٹے کے تاروں سے سجا سجایا دیکھنے کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ اب کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ خوبانیاں درختوں میں بھی لگ سکتی ہیں۔

فاضل پروفیسر تا دیر اس روح پرور منظر سے محظوظ ہوتے رہے بلکہ اس کے کچھ لذیذ حصے تناول بھی فرمائے۔

(۳)

پہلا مسئلہ رہائش کا تھا۔ اس کا انتخاب و انتظام پروفیسر کی ناقص رائے پر چھوڑ دیا گیا، مگر ان کی نظر میں کوئی ہوٹل نہیں جچتا تھا۔ ایک "الٹرا ماڈرن" ہوٹل کو اس لیے ناپسند کیا کہ اس کے غسل خانے بڑے کشادہ تھے، مگر کمرے مُوذی کی گور کی طرح تنگ۔ دوسرے ہوٹل کو اس لیے کہ وہاں معاملہ برعکس تھا اور تیسرے ہوٹل کو اس وجہ سے کہ وہاں دونوں چیزیں ایک ہی ڈیزائن پر بنائی گئی تھیں۔ یعنی ——— آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ چوتھے عالیشان ہوٹل سے اس بنا پر بھاگ لیے کہ بندہ کسی ایسے ہوٹل میں ٹھیرنے کا روادار نہیں، جہاں کے بیرے مسافروں سے زیادہ اسمارٹ ہوں۔ پھر کار پانچویں ہوٹل کے پورچ میں جا کر رُکی، جہاں ایک سائن بورڈ دو دو فٹ لمبے حروف میں

دعوتِ طعام و قیام دے رہا تھا :

گھر کی سی غذا اور فضا

اب کی دفعہ مرزا بدک گئے۔ کہنے لگے "صاحب! میں ایک منٹ بھی ایسی جگہ نہیں رہ سکتا، جہاں پھر وہی ——"

جملہ مکمّل ہونے سے پہلے ہم اُن کا مطلب سمجھ کر آگے بڑھ گئے۔

چھٹا نمبر "جنتان" ہوٹل کا تھا۔ انگریزوں کے وقتوں کی یہ ترشی ترشائی سی عمارت سفیدے کے چکنے چکنے تنوں کی اوٹ سے یُوں جھلملا رہی تھی جیسے سالگرہ کا کیک —! دیکھتے ہی سب لوٹ ہو گئے۔ پروفیسر نے آگے بڑھ کر اُس کے از کار رفتہ اینگلو انڈین منیجر سے بعد مصافحہ کرایہ دریافت کیا۔ جواب ملا سنگل رُوم —— پچپن روپے یومیہ۔ ڈبل رُوم —— میاں بیوی کے لیے —— پچھتّر روپے۔ سب سنّاٹے میں آ گئے۔ ذرا اَوسان دُرست ہُوئے تو مرزا نے سُوکھے منہ سے پُوچھا

"کیا اپنی ذاتی بیوی کے ساتھ بھی پچھتّر روپے ہوں گے ؟"

بارے رہنے کا ٹھکانہ ہُوا تو سیر سپاٹے کی سُوجھی۔ پروفیسر کو کوئٹہ بحیثیتِ مجموعی بہت پسند آیا۔ "یہ بحیثیتِ مجموعی" کی بیخ ہماری نہیں، انھیں کی لگائی ہُوئی ہے۔ دِل میں وُہ اِس شہرِ نگاراں، اِس سیرگاہِ مغرُوراں کی ایک ایک ادا، بلکہ ایک ایک اِینٹ پر نثار تھے۔ لیکن محفل میں کُھل کر تعریف نہیں کرتے تھے، مبادا لوگ انھیں ٹُورسٹ بیُورو کا افسر سمجھنے لگیں۔ چار پانچ روز بعد ہم نے تخلیے میں پُوچھا، کہو، ہِل اسٹیشن پسند آیا؟ بولے، ہاں! اگر یہ پہاڑ نہ ہوں تو جگہ اچھی ہے! پُوچھا، پہاڑوں سے کیا ہرج ہے؟ بولے، بقول مجاز دُوسری طرف کا منظر نظر نہیں آتا۔ دراصل انھیں بے برگ و گیاہ پہاڑ دیکھ کر قدرے مایُوسی ہُوئی۔ چنانچہ

ایک دِن کہنے لگے :

"مرزا! یہ پہاڑ تمھارے سر کی طرح کیوں ہیں؟"

"ایک زمانے میں یہ بھی دیوداروں اور صنوبروں سے ڈھکے ہُوئے تھے۔ پربت پربت ہریالی ہی ہریالی تھی۔ مگر بکریاں سب چٹ کر گئیں۔ اسی لیے حکومت نے بکریوں کے اِستیصال کے لیے ایک محاذ بنایا ہے اور پُوری قوم خنجر بکف حکومت کے ساتھ ہے۔"

"مگر ہمیں تو یہاں کہیں بکریاں نظر نہیں آئیں۔"

"انھیں یہاں کے باشندے چٹ کر گئے۔"

"لیکن مجھے تو گلی کُوچوں میں یہاں کے اصلی باشندے بھی دِکھائی نہیں دیتے۔"

"ہاں! وہ اب سبّی* میں رہتے ہیں!"

ہم نے دونوں کو سمجھایا، آج درخت نہیں ہیں تو کیا۔ محکمۂ جنگلات سلامت ہے تو کیا نہیں ہو سکتا۔ اِرشاد ہُوا، صاحب! محکمۂ جنگلات ہے تو ہُوا کرے۔ اِن "کلین شیو" پہاڑوں میں اُس کے غالباً وُہی فرائض ہوں گے جو افغانستان میں بحری بیڑے کے! پروفیسر یہ سنگلاخ پہاڑ دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ ایسے خالص پہاڑ، جن میں پہاڑ کے علاوہ کچھ نہ ہو، دُنیا میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔ مرزا نے بہتیرا سمجھایا کہ پہاڑ اور ادھیڑ عورت دراصل آئل پینٹنگ کی طرح ہوتے ہیں ——— انھیں ذرا فاصلے سے دیکھنا چاہیے۔ مگر پروفیسر دُور کے جلوے کے قائل نہیں۔ بے شجر پہاڑوں سے ان کی بیزاری

* سبّی : کوئٹہ سے کوئی سَو میل دُور ایک انتہائی گرم (۱۲۰ — ۱۱۵ ڈگری) مقام، جسے کوئٹہ کا دروازہ کہنا چاہیے، کیونکہ ہر ریل جو اِدھر کو جاتی ہے سبّی سے گزر کر جاتی ہے

کم کرنے کی غرض سے مرزا نے ایک دن غروبِ آفتاب کے وقت کوہِ مُردار کے سلسلے کی وُہ مشہور سُرمئی پہاڑی دکھائی، جس کے "سلوٹ"★ کو دیکھنے والا اگر نظر جما کر دیکھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک نازک اندام نازنین مُردہ پڑی ہے۔ اس کے پیچھے کو پھیلے ہوئے بال، کُشادہ پیشانی، چہرے کا تیکھا تیکھا پروفائل اور سینے کے تکون غور سے دیکھنے پر ایک ایک کر کے اُبھرتے چلے جاتے ہیں۔ مرزا اُنگلی پکڑ کے پروفیسر کو اس تصویر کے "ہجے" کراتے گئے۔ موصُوف اپنی آنکھوں پر دائیں ہاتھ کا چھجّا بنا کر بغور دیکھتے رہے اور اس حسین و حزیں منظر سے نہ صرف متأثر ہُوئے بلکہ بعد معائنہ اعلان فرمایا کہ نازک اندام نازنین مری نہیں، صرف بے ہوش ہے۔

پہاڑوں کی تہی دامنی سے گلہ دو دن بعد دُور ہُوا جب سب منزلیں مارتے قائدِ اعظم کے محبُوب ہل اسٹیشن زیارت (آٹھ ہزار فٹ) پہنچے۔ جہاں تک پروفیسر کی عینک کام کرتی تھی، ہرا ہی ہرا نظر آ رہا تھا۔ بستر بند کھلنے سے پہلے فاضل پروفیسر نے ایک پہاڑی سر کر ڈالی اور اس کی چوٹی پر پہنچ کر تصویریں بھی اُتروائیں، جن میں ان کے ہونٹوں پر وہ فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی، جو نوّابین و مہاراجگان کے چہروں پر مُردہ شیر کے سر پر رائفل کا کندا رکھ کر فوٹو کھنچواتے وقت ہُوا کرتی تھی۔ وہ اس سرکش چوٹی کی بلندی آٹھ ہزار پچاس فٹ بتاتے تھے۔ اور اس میں قطعی مبالغہ نہ تھا۔ اس لیے کہ سطحِ سمندر سے اس کی بلندی اتنی ہی تھی، گو کہ زمین کی سطح سے صرف پچاس فٹ بلند ہو پائی تھی۔ جھوٹ سچ کا حال اللہ جانے، مگر مرزا کا حلفیہ بیان ہے کہ کوہِ مفتوحہ کی چوٹی پر قدم رکھنے کے پانچ منٹ بعد تک فاتح پروفیسر کے ہانپنے کی آواز پچاس فٹ نیچے "بیس کیمپ" میں صاف

★ سلوٹ: چہرے کے ایک رُخ کی آؤٹ لائن، جس میں سیاہ رنگ بھرا ہو۔

سُناتی دیتی تھی، جہاں ضرغوص مُووی کیمرہ لیے شام کی نارنجی روشنی میں اِس تاریخی منظر کو فلمارہے تھے۔ مذکورہ مہم کے آخری مراحل میں پروفیسر نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ ایسے پہاڑوں پر حکومتِ بجلی کی لفٹ لگادے تو ملک میں کوہ پیمائی کا شوق پیدا ہو جائے۔ اِس تن آسانی پر مرزا نے طعنہ دیا کہ ہماری ہی قوم کا ایک فرد ظہیر الدّین بابر کہ جس کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے یہ کوہ و دمن، یہ دشت و جبل کبھی گونجے تھے، دو قوی الجثہ مغل سپاہیوں کو بغل میں دبا کر قلعے کی فصیل پر بے تکان دوڑتا تھا۔ یہ سُنتے ہی پروفیسر چشمے کے پاس ستانے بیٹھ گئے۔ اِس کے صاف شفّاف پانی سے ہاتھ پاؤں دھوئے اور گلے میں لٹکی ہوئی چھاگل سے مری بیئر انڈیلتے ہُوئے بولے، مگر ہماری تاریخ بابر پر ختم نہیں ہوتی سرکار! آپ یہ کیسے بھُول گئے کہ واجد علی شاہ، تاجدارِ اودھ جب زینے پر لڑکھڑاتے ہُوئے چڑھتے تو سہارے کے لیے (اُس زمانے میں لکڑی کی "ریلنگ" ایجاد نہیں ہُوئی تھی) ہر سیڑھی پر، جی ہاں! ہر سیڑھی پر دونوں طرف نوخیز کنیزیں کھڑی رہتی تھیں ——— مغلوں کی تلوار کی طرح خمیدہ و بے نیام!

پروفیسر نے جغرافیائی دُشواریوں پر اس طرح قابو پانے کے اور بھی کئی تاریخی طریقے بیان کیے۔ جن کے معتبر ہونے میں شُبہ ہو تو ہو، نُدرت میں کلام نہیں۔ لیکن چوٹی سر کرنے کے بعد جب وہ سنبھل سنبھل کر گھٹنیوں اُتر رہے تھے تو برابر کی چوٹی پر ایک مہیب پرچھائیں نظر آئی۔ پہاڑوں میں سُورج جلدی ڈُوب جاتا ہے اور اس وقت منظر کی جُزئیات پر رات کا کاجل پھیلتا جا رہا تھا۔ سنّاٹا ایسا مکمّل، ایسا شفّاف اور آر پار کہ کلائی اپنے کان سے لگا کر سُنیں تو نبض کی دھک دھک صاف سُنائی دے۔ دفعتہً پُراسرار پرچھائیں نے حرکت کی۔ پروفیسر کے مُنہ سے بے اختیار ایک چیخ نکلی اور نکلتی چلی گئی۔ اور جب وُہ نکل

چکی تو "ریچھ" کہہ کر وہیں سجدے میں چلے گئے۔ مرزا کو بھی ہدایت کی کہ جہاں ہو، وہیں بیٹھ جاؤ اور سگرٹ بجھا دو۔ مرزا پہلے ہی برفانی ریچھوں کے قصّے سُن چکے تھے۔ یُوں بھی سیدھے سادے مُسلمان ہیں، لہٰذا ہدایت پر آنکھ بند کر کے عمل کیا، بلکہ عمل کے بعد بھی آنکھ بند ہی رکھّی۔ لیکن کچھ دیر بعد جی کڑا کر کے اُسے کھولا تو پُوچھنے لگے "مگر یہ میں میں کیوں کر رہا ہے؟" پروفیسر نے سجدے ہی میں ذرا دیر کان لگا کر سُنا اور پھر اُچھل کر کھڑے ہو گئے فرمایا "ارے صاحب! آواز پر نہ جائیے۔ یہ بڑا مکّار جانور ہوتا ہے!"

(۴)

ضرغوص جس اہتمام و انصرام سے سفر کرتے ہیں، وہ دیدنی ہے۔ محمّد شاہ رنگیلے کے متعلّق تو سُنا ہی سُنا تھا کہ جب اس کی فوج ظفر موج نادر شاہ دُرّانی سے لڑنے نکلی تو جرنیل حسبِ مناصب چھوٹی، بڑی، منجھولی پالکیوں میں سوار احکام صادر کرتے جا رہے تھے اور آگے آگے خدمت گار اُن کی آبدار تلواریں اُٹھائے چل رہے تھے۔ من جملہ دیگر ساز و سامانِ حرب کے کئی چھکڑے مہندی سے لدے جلو میں تھے تاکہ سپاہی اور سپہ سالار اپنے ہاتھ پیروں اور بالوں کو رَن میں جانے سے پہلے شاہ پسند رنگ میں رنگ سکیں۔ مرزا سے روایت ہے کہ سفر تو خیر سفر ہے۔ ضرغوص شہر میں بھی اتنی وضعداری برتتے ہیں کہ ان کا بڑا لڑکا کرکٹ کھیلتا ہے تو چپراسی چھتری لگائے ساتھ ساتھ دوڑتا ہے۔ غالبؔ کی طرح ضرغوص تیغ و کفن ہی نہیں، تختۂ غسل اور کافور تک باندھ کر لے جانے والوں میں سے ہیں۔ لحاف اور ململ کا کُرتا، نمک اور کوکا کولا، تاش اور کیسانوا (اُن کا سیاہ کتّا)، ڈنر جیکٹ اور "پک وِک پیپرز"، بندوق اور فرسٹ ایڈ کا بڑا بکس۔

غرضیکہ کونسی غیرضروری چیز ہے جو دورانِ سفر اُن کی زنبیل میں نہیں ہوتی؟ البتّہ اس ترتیب واپسی پر انھیں یہ قلق رہا کہ سفر یُوں تو ہر لحاظ سے کامیاب رہا، مگر فرسٹ ایڈ کا سامان استعمال کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا۔

ان کے اندر جو شہری بسا ہُوا ہے، وہ کسی طرح اور کسی لمحے ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر کبھی بادام کے تنے پر چاقو کی نوک سے اپنا نام اور تاریخ آمد لکھواتا ہے اور کبھی پہاڑی چکور کے شوخ رنگوں کی داد بائیس بور کی گولی سے دیتا ہے۔ کبھی گونجتے گرجتے آبشاروں کے دامن میں "راک اینڈ رول" اور "ٹوئسٹ" کے ریکارڈ بجا کر سیٹیوں سے سنگت کرتا ہے اور کبھی جنگلوں کی سیر کو یُوں نکلتا ہے گویا "ایلفی"★ یا "مال" پر شام کے شکار کو نکلا ہے

مرزا نے بارہا سمجھایا، دیکھو! پہاڑوں، جنگلوں اور دیہاتوں میں جانا ہو تو یُوں نہ نکلا کرو ــــ یوڈی کلون لگائے، سگار منہ میں، ہر سانس بئیر میں بسا ہُوا، باتوں میں ڈرائنگ روم کی مہک ــــ اِس سے دیہات کی بھینی بھینی خوشبوئیں دَب جاتی ہیں۔ وہ سہمی سہمی خوشبوئیں جو یاد دِلاتی ہیں کہ یہاں سے دیہات کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ وہ سرحد جہاں سدا خوشبوؤں کی دھنک نکلی رہتی ہے ــــ کچّے دُودھ اور تازہ کٹی ہُوئی گھاس کی میٹھی میٹھی باس، چھپّروں، کھپریلوں سے چھَن چھَن کر نکلتا ہُوا اُپلوں کا کڑوا کڑوا دُھواں، گھُمر گھُمر چلتی چکّی سے پھسلتے ہوئے مکئی کے آٹے کی گرم گرم سگند کے ساتھ "وہ کنوار پتے کی تیز مہک"، جوہڑ کی کائی کا بھیگا چھچھلاندا جھونکا، سرسوں کی بالیوں کی کٹیلی مہکار، بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کا بھبکا، انگاروں پر سنکتی ہُوئی روٹی کی سیدھی معدے میں گھُس جانے والی لپیٹ اور ان سب میں رَچی ہُوئی، ان سب میں گھُلی ہُوئی کھیتوں اور کھلیانوں میں تانبا سے تپتے ہُوئے جسموں

★ ایلفی : ایلفنسٹن اسٹریٹ، کراچی

Scanned with CamScanner

کی ہزاروں سال پُرانی مہک ——— یہ زمین کے وحشی سانس کی خوشبو ہے۔ زمین کو سانس لینے دو۔ اِس کی خوشبو کے سوتے خون سے جا ملتے ہیں۔ اسے مساموں میں سہج سہج جذب ہونے دو۔ اسے ہوا ناسگار اور "ڈیوڈورنٹ"★ سے نہ مارو کہ یہ ایک دفعہ جس بستی سے رُوٹھ جاتی ہے، پھر لَوٹ کر نہیں آتی۔ تم نے دیکھا ہوگا، چھوٹے بچّوں کے جسم سے ایک پُراسرار مہک آتی ہے۔ کچّی کچّی، کوری کوری، جو بڑے ہو کر اچانک غائب ہو جاتی ہے۔ یہی حال بستیوں کا ہے۔ شہر اب بُوڑھے ہو چکے ہیں۔ اُن میں اپنی کوئی خوشبو باقی نہیں رہی۔

پروفیسر قدّوس کو ایسی باتوں میں "لا دے اِک جنگل مجھے بازار سے" والا فلسفہ نظر آتا ہے۔ جو سفید کالر والوں کی خوشبودار فراریت کی پیداوار ہے۔ کہتے ہیں شہری غزالوں کا نافہ اُن کے سر میں ہوتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بحث میں چاروں طرف سے شہ پڑنے لگے تو وہ مزاہی کے کسی نیم فلسفیانہ فقرے کی فصیلوں کے پیچھے دبک جاتے ہیں اور اس لحاظ سے اُن کا رویّہ ٹھیٹ پروفیسرانہ ہوتا ہے۔ یعنی اصل متن کے بجائے محض فٹ نوٹ پڑھنا کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔ لیکن ضرغوص کا عمل صحّت مندانہ نہ سہی، صحّت افزا ضرور ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ وہ مناظرِ قدرت کی داد اپنے معدے سے دیتے ہیں۔ جہاں موسم خوشگوار اور منظر خوش آئند ہُوا، اور ان کی سمجھ میں اس سے لطف اندوز ہونے کا ایک یہی طریقہ آیا کہ ڈٹ کر کھایا جائے اور بار بار کھایا جائے۔ اور اس خوشگوار شغل سے جو تھوڑا سا وقت بچ رہے، اُس میں رمی کھیلی جائے۔ یہاں بدقسمتی سے موسم ہمیشہ اچھّا رہتا تھا۔ اِس لیے روزانہ کھانے کے درمیانی وقفوں میں رمی کی بازی جمتی۔ مخلص دوستوں نے اِس طرح پُورے چھ ہفتے ایک دُوسرے کو کنگال بنانے کی مخلصانہ کوششوں میں گزار دیے۔

★ ڈیوڈورنٹ : قدرتی بُو کو زائل کرنے والی دوائیں۔

ضرغوص تو آنکھ بچا کر پتّا بدلنے میں بھی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ اس لیے کہ یہ نہ کریں تب بھی پروفیسر ہر جتینے والے کو بے ایمان سمجھتے ہیں۔ بہر صورت ہم نے تو یہ دیکھا کہ اَن گنت شاداب لمحے، جو چیڑ اور چنار کے نظّارے میں صَرف ہو سکتے تھے، وہ دونوں نے چڑیا کے غُلام اور پان کے چوّے پر نظریں جمائے گزار دیے اور کبھی پلٹ کر پُرہیبت پہاڑوں پر ڈُوبتے سُورج اور چڑھتے چاند کا جلال نہیں دیکھا اور نہ کبھی آنکھ اٹھا کر اس رُوپ نگر کی آن دیکھی، جس کے سر سے زلزلے کی قیامت گزر گئی، مگر جہاں آج بھی گلاب دہکتے ہیں۔ رہگزاروں پر بھی اور رُخساروں پر بھی۔ اِن کی کنپٹیوں پر اب رُوپہلی تار جھلملانے لگے ہیں، مگر وہ ابھی اس لذّتِ آوارگی سے آشنا نہیں ہُوئے جو ایک پل میں ایک جُگ کا رس بھر دیتی ہے۔ ابھی انھوں نے ہر پھُول، ہر چہرے کو یُوں جی بھر کے دیکھنا نہیں سیکھا، جیسے آخری بار دیکھ رہے ہوں، پھر دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ ایسے ہی کوہساروں اور وادیوں سے گزرتے ہُوئے بابر نے اپنی تُزک میں کتنی مایُوسی کے ساتھ لکھا ہے کہ جب ہم کسی دریا کے کنارے پڑاؤ ڈالتے ہیں تو ہم اور ہماری مغل فوج اپنے خیموں کا رُخ دریا کے دلکش منظر کی طرف رکھتے ہیں، لیکن ہماری ہندی فوج اپنے خیموں کی پیٹھ دریا کی طرف کر لیتی ہے۔

یہاں ضرغوص کی کم نگہی دکھانی مقصود نہیں۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ کراچی پہنچ کر اُنھوں نے اپنی کھینچی ہُوئی رنگین فلمیں اسکرین پر دیکھیں تو دنگ رہ گئے۔ کہنے لگے، یار! کمال ہے! ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئٹہ خوبصورت جگہ ہے!

(۵)

ضرغوص خود کو ہیون سانگ اور ایڈمنڈ ہلیری سے کم نہیں سمجھتے۔ بایں ادعائے

سیاحی کیفیت یہ ہے کہ ایک دن مرزا نے پوچھا، یار! کن چن چنگا بھی دیکھی؟ ارشاد ہوا نہیں۔ ہم چینی فلمیں نہیں دیکھتے۔ مگر کون سی فلم میں کام کر رہی ہے؟ مرزا بھی ان کے ہمراہ دوسری مرتبہ اپنا ملک دریافت کرنے نکلے تھے، مگر جہاں گئے، جدھر گئے، خود ہی کو مقابل پایا۔ آخر دو مہینے جغرافیہ میں سوانح عمری کا رنگ بھر کے لوٹ آئے۔ کہنا پڑے گا کہ ایک کا دل اور دوسرے کی آنکھیں شہری ہیں اور اس کی تصدیق قدم قدم پر پچھلے سفر کی روداد سے ہوتی ہے۔ آپ بھی سنیے، کبھی ان کی، کبھی اُن کی زبانی۔ ضرغوص کا بیان ہے کہ تیورس کے سال مرزا وادیِ کاغان میں گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر فیروزی رنگ کی منجمد جھیل، میلوں تک پھیلے ہوئے گلیشیر اور برفپوش پہاڑ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ملائی کی برف کے علاوہ بھی کوئی برف ہو سکتی ہے اور وہ بھی مفت! کم و بیش اتنی ہی شدت کا عالمِ جذب دریائے کنہار دیکھ کر انھوں نے اپنے اوپر طاری کر لیا۔ اس تلملاتی، جھاگ اڑاتی، کوہستانی ندی کے پل پر دیر تک دم سادھے دریائے حیرت میں غوطہ زن رہے۔ آخر ایک دُرِ خوش آب لے کر ابھرے۔ فرمایا، کس قدر خوبصورت جھاگ ہیں! بالکل لکس صابن جیسے! حاضرین نے اس اشتہاری تشبیہ کا مذاق اڑایا تو تنک کر بولے، صاحب! میں تو جب جانوں کہ ورڈزورتھ کو درمیان میں لائے بغیر آپ نیچر پر دو جملے بول کر دکھا دیں۔

مرزا بطورِ جواب آں غزل، اسی مقام اور اسی گھڑی کا ایک اور سماں کھینچتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ مردانِ خوش اوقات کس کس طرح مناظرِ قدرت کی منزلت بڑھاتے ہیں۔ (تصویر میں جگہ جگہ ضرغوص نے بھی شوخ رنگ لگا دیے ہیں۔) یہ مقام بالاکوٹ کے دامن میں اس کنارے پر واقع ہے، جہاں ندی دو بھاری پہاڑوں کے درمیان نرتکی کی

کمر کی طرح بل کھا گئی ہے۔ اس سے یہ کرامت منسوب ہے کہ جہانگیر کے ہمراہ اس راستے سے کشمیر جاتے ہوئے نورجہاں کی آنکھوں میں سوزش ہوئی۔ جہانگیر کو رات بھر نیند نہ آئی۔ شاہی طبیب کے سُرمہ و کحل و ضماد سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ ناگاہ ایک درویش باصفا کا ادھر سے گزر ہوا۔ اُس نے کہا جیسے ہی چاند اس صنوبر کے اُوپر آئے ملکہ ندی کا پانی انجل میں بھر کے اس میں اپنا چہرہ دیکھے اور اسی سے سات دفعہ آنکھیں دھوئے مولا اپنا فضل کرے گا۔ نورجہاں نے ایسا ہی کیا اور تارا سی آنکھیں ہو گئیں۔ اُس دن سے اس مقام کا نام نین سکھ ہو گیا اور ادھر سے گزرتے ہوئے آج بھی بہت سے ہاتھ موتی سا پانی چلّو میں بھر کے اس البیلی ملکہ کی یاد تازہ کر جاتے ہیں۔

ہاں! تو یہ مقام تھا اور شروع برسات کی رات! صبح اسی جگہ ایک تاریخی فلم کی شوٹنگ کے دوران ہیروئن کے پیر میں موچ آ گئی تھی اور چراغ جلے تک وادیِ بالاکوٹ کا ہر وہ باشندہ جو اُس دن صاحبِ فراش نہیں تھا، اِس گھوڑے کو دیکھنے آیا، جس سے ہیروئن گری یا گرائی گئی تھی اور اس وقت جب رات کی جوانی ابھی نہیں ڈھلی تھی، یہاں اسی فلم کے پروڈیوسر (جن کا مقدمہ مجسٹریٹی سے سشن جج اور سشن جج سے ہائی کورٹ اور ہائی کورٹ سے سپریم کورٹ تک ضرغوص نے بلا معاوضہ و محنت لڑا اور ہارا تھا) ضرغوص کی خاطر تواضع میں بچھے جا رہے تھے۔ ساتھ شہد جیسی رنگت کے بالوں والی ہیروئن بھی تھی، جو ٹرانزسٹر ریڈیو پر "چا چا چا" کی دُھن پر بیٹھے ہی بیٹھے اپنی غیر مادّی ٹانگ تھرکا رہی تھی اور مرزا کے الفاظ میں "اوپن ائیر ہوسٹس" کے فرائض بڑی تن دہی سے انجام دے رہی تھی۔ ضرغوص فیروزے کی انگوٹھی سے "پک وک پیپرز" کی جلد پر تال دے رہے تھے۔ ریڈیو پر کوئی گرم گیت آتا تو سب کے سب سُر ملا کر اتنے زور سے ڈکرانے لگتے کہ اصل گانا

Scanned with CamScanner

ذرا سُنائی نہ دیتا۔ صِرف ناپسندیدہ گانے خاموشی اور توجّہ سے سُنے گئے۔ البتّہ مرزا سرِشام ہی سے بوجہ سنجیدگی و سردی خاموش تھے۔ انھیں جب زیادہ سردی محسُوس ہونے لگتی تو بے اختیار ان مہیب مشعلوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتے، جو بیس میل دُور پہاڑوں پر ایک مہینے سے رات ہوتے ہی روشن ہو جاتی تھیں۔ ایک مہینے سے کاغان کے جنگل دھڑ دھڑ جل رہے تھے اور دور دور سے سیّاح صنوبروں کی آگ دیکھنے لائے جا رہے تھے۔ لیکن یہاں چاروں طرف تہ در تہ تاریکی تھی، جس میں پہاڑی جگنو جا بجا مُسلمانوں کی اُمّیدوں کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔ مرزا نظریں نیچی کیے رس بھری گنڈیریاں چُوستے رہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ضرغوص اپنی کار کی ہیڈ لائٹ جلا دیتے اور سانولی رات اپنے راز سپرد کر کے چند قدم پیچھے ہٹ جاتی۔ اُن کے سونے کے دانت سے شعاعیں پھُوٹنے لگتیں اور کیسانووا کی شب تاب آنکھوں کے چراغ جل اُٹھتے۔ کچھ اور سپکیر بھی جنھیں روشنی نے رات کی چٹان چیر کر تراشا تھا، نظر کے سامنے کونڈ جاتے

چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہُوئے

اِس کونڈے میں ندّی جھما جھم کرنے لگتی۔ جیسے ٹسّو کی ساری۔ (معاف کیجیے، یہ تیر بھی اسی ترکش کا ہے۔)

سامنے مرزا خاموش زانوئے تلمّذ تہ کیے بیٹھے تھے۔ کچھ برفانی ہوا، کچھ گنڈیری کا اثر۔ اُن کا ہاتھ اپنی ناک پر پڑا تو ایسا لگا جیسے کسی دُوسرے کی ہے۔ پھر ندّی کے پانی میں ہاتھ ڈالا تو محسُوس ہُوا، گویا پگھلی ہُوئی برف ہے۔ اور یہ اس لیے محسُوس ہُوا کہ وہ واقعی پگھلی ہُوئی برف تھی، جس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے بلیک اینڈ وہائٹ کی دُوسری بوتل کی گردن مرزا کی ٹائی سے باندھ کر ندی میں ڈال دی گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے پروڈیوسر

صاحب کو ایک شمپین گلاس کے کنارے پر لپ اسٹک کا گمان گزرا تو اتنا حصّہ اپنے دانتوں سے توڑ کر کٹر کٹر چبانے لگے اور اب وہ اندھیرے میں سگرٹ کا کش لیتے تو دہانے کے دونوں کونوں پر جیتے جیتے خون کی دھاریں چمک اٹھتی تھیں۔ گنڈیریوں سے فارغ ہو کر مرزا اس منظر کو آنکھوں سے پیے جا رہے تھے، جن میں اب گلابی ڈورے اُبھر آئے تھے، جو غالباً نیند کے ہوں گے۔ اس لیے کہ گنڈیری میں اگر نشہ ہوتا تو مولوی گنّے لے کر گنڈیری کھانے والوں کے پیچھے پڑ جاتے۔ اُن کے طور بے طور ہوتے دیکھے تو ضرغوص نے شانے جھنجھوڑ کر پوچھا، مرزا! تم نے کبھی وہسکی پی ہے؟ خمار آلود آنکھیں کھولتے ہوئے بولے پی تو نہیں، مگر بوتل سے ایسی بو آتی ہے، جیسی ان کے منہ سے۔ بالکل ٹنکچر آئیڈین جیسی۔ یہ کہہ کر تصدیق طلب نظروں سے پروڈیوسر کو دیکھنے لگے، جو اس ٹنکچر آئیڈین سے اپنے منہ اور دل کے زخموں کو ڈِس انفکٹ کر رہے تھے۔ یہ شغل اس وقت تک جاری رہا، جب تک نہ پینے والوں نے نیند سے بے حال ہو کر اول فول بکنا شروع نہ کر دیا اور اواخرِ ماہ کی چاندنی میں فرازِ بالاکوٹ پر اس مقبرے کے خطوط دمکنے لگے، جہاں سوا سو سال پہلے اسی وادی، اسی رُت اور اُترتے چاند کی انہی تاریخوں میں ایک جیالے★ نے اپنے خون سے اپنی قوم کے داغوں کو دھویا تھا اور جہاں آج بھی خدا کے سادہ دل بندے نسوار کی نذر چڑھا کر مرادیں مانگتے نظر آجاتے ہیں۔

(۶)

بات ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ جا پہنچی۔ دکھانا صرف یہ تھا کہ پہاڑ پر زندگی

★ حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

ہر ڈھنگ اور ہر ڈھب سے گزاری جا سکتی ہے۔ ہنس کر، رو کر یا اکثریت کی طرح سو کر۔ مرزا کسی گھر بند نہیں۔ کچھ نہیں تو چوری چوری بیگم ضرغوص کے محبت اور املا کی غلطیوں سے بھرے ہوئے خط ہی پڑھتے رہتے۔ مگر ایک دن ایک عجیب رنگ میں پائے، بلکہ پکڑے گئے۔ دیکھا کہ مختلف رنگوں اور خوشبوؤں کے ٹوتھ پیسٹ سے کیرم بورڈ پر کچھ پینٹ کر رہے ہیں۔ خیر، ٹوتھ پیسٹ کے استعمال پر تو ہمیں کوئی اچنبھا نہیں ہوا۔ اس لیے کہ سن چکے تھے کہ ابسٹریکٹ آرٹسٹ (تجریدی مصوّر) تصویر پر نیل پالش اور فنائل تک لگانے سے نہیں چوکتے اور ایک صاحب ایسے بھی گزرے ہیں، جنھوں نے کینوس پر گھوڑے کا نعل، اپنے کٹے ہوئے ناخن اور اکلوتی پتلون کے ساتوں بٹن ماڈل کی چوسی ہوئی گم سے چپکا کر بغدادی جم خانہ پرائز حاصل کیا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ کہ آرٹسٹوں کی صحبت میں رہتے رہتے ہم ایسی باتوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ ٹھٹھیرے کا کبوتر تالیوں سے نہیں اڑتا۔ لیکن اس وقت پریشانی جو ہوئی تو اس بات سے کہ ہماری رسمی تعریف کو سچ سمجھ کر وہ ہمیں سے اس خوش ذائقہ تصویر کا عنوان پوچھنے لگے۔

"عنوان میں کیا رکھا ہے۔ اصل چیز تو تصویر ہوتی ہے، تصویر!" ہم نے ٹالنا چاہا۔

"پھر بھی۔ کیا نظر آتا ہے تمھیں؟" وہ بھلا چھوڑنے والے تھے۔

"نظر تو آتا ہے، مگر سمجھ میں نہیں آتا"۔

"پکاسو سے بھی کسی نے کہا تھا کہ صاحب! آپ کی تصویریں سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس نے بڑا پیارا جواب دیا۔ کہنے لگا، چینی زبان آپ کی سمجھ میں نہیں آتی، مگر پچاس کروڑ آدمی اسے بولتے ہیں۔ کیا سمجھے؟"

"لیکن یہ تصویر تو پکاسو کی بھی سمجھ میں نہیں آسکتی"۔ ہم نے کہا۔

"بلا سے نہ آئے۔ ایک رقاصہ اپنے حُسن و کمال کی داد لینے دُوسری رقاصہ کے پاس نہیں جاتی۔ داد تو تماشائیوں سے ملتی ہے"۔ مرزا نے کہا۔

اُنھوں نے بقول شخصے، عالمِ بالا کی بات کو بالاخانے تک پہنچا کر دم لیا۔

ضرغوص کی طرح مرزا بھی ہل اسٹیشن کو ایک پیدائشی شہری کی پیار بھری نظر سے دیکھتے ہیں اور نظر بھی ایسے شہری کی، جس کی ولادت اور پہلی علالت کی تاریخ ایک ہی ہو۔ خیر، مرزا تو ہمارے ہم جلیس و دمساز ٹھہرے، جن کے رگ و ریشے سے ہم اس طرح واقف ہیں جیسے اپنی ہتھیلی سے۔ لیکن اِس دفعہ ہمیں ضرغوص اور ہل اسٹیشن دونوں کو بہت قریب سے دیکھنے کا اتّفاق ہُوا اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ خُدا اگر آنکھیں دے تو انھیں استعمال کرنے کے مواقع بھی دے۔ ورنہ حیف ہے ایسی زندگی پر۔ لیکن ہل اسٹیشن پر ـــــ خواہ وہ مری ہو یا مسُوری، اوٹاکمنڈ ہو یا کوئٹہ ـــــ زندگی ہماری آپ کی طرح بے مقصد نہیں ہوتی۔ اس کا ایک مقصد، ایک مطمحِ نظر ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ سدا سُہاگن سڑکوں پر وُہ فیشن پریڈ دیکھی جائے، جس میں ہر سال آسُودہ حال گھرانوں کی ناآسُودہ بہُو بیٹیاں دُھن اور تن کی بازی لگا دیتی ہیں۔ انھی سڑکوں پر کالی کافی اور آلُو کی ہوائیوں پر گُزارہ کرنے والے ادیب بگیاتی زبان میں ایک دُوسرے کو خُونیں انقلاب پر اُکساتے ہیں۔ انھی سڑکوں پر اپنے گلدان میں برگد اُگانے والے انٹلکچوئل کسی خُوبصُورت لڑکی کو شرفِ زوجیّت بخشنے کی گھات میں لگے رہتے ہیں۔ اُدھر خُوبصُورت لڑکی چراغِ رُخِ زیبا لیے اِس تلاش میں سرگرداں کہ جلد از جلد کسی بُوڑھے لکھ پتی کی بیوہ بن جائے! یہ سوئمبر، یہ سُہاگ رُت ہر ہل اسٹیشن پر ہر سال منائی جاتی ہے اور اس سے پہلے کہ سبزۂ نورُستہ برف کا کفن پہن کر سو جائے،

چناروں کی آگ سرد اور قہوہ خانے ویران ہو جائیں۔ مویشی میدانوں میں اُترنے لگیں اور سڑکوں پر کوئی ذی رُوح نظر نہ آئے، بجز ٹورسٹ کے ـــــ اس سے پہلے کہ موسم گُل بیت جائے، بہت سے ہاتھوں کی تیسری اُنگلی میں انگوٹھیاں جگمگانے لگتی ہیں۔ اگرچہ ضرغوص کے سہرے کے پھول دو دفعہ کھلنا کیا، مرجھا چکے ہیں، مگر اب بھی سڑک پر ڈھیر سارے حسین چہرے دیکھ کر اُن کا حال ایسا ہوتا ہے، جیسا کھلونوں کی دُکان میں یتیم بچّے کا!

اس سوئمبر کے پہلو بہ پہلو ہل اسٹیشن پر سارے ملک کے لاعلاج رُؤسا اور متموّل لاغروں کا عظیم الشّان سالانہ میلہ لگتا ہے، جس میں وسیع پیمانے پر تبادلۂ امراض ہوتا ہے۔ آپ نے شاید سُنا ہو کہ بنارس میں جو اپنی صبح اور ساریوں کے باوجود ایک پوتر استھان کی حیثیّت سے بھی مشہور رہے، سارے ہندوستان کے ضعیف الاعتقاد بُوڑھے مرنے کے لیے کھنچ کھنچ کر آتے ہیں اور بہت جلد دلی مُراد پاتے ہیں۔ جو بیمار اپنی قوّتِ ارادی کی کمزوری کے سبب خُود کو مرنے کے لیے تیار نہیں کر پاتے، وہ قریب ترین ہل اسٹیشن کا رُخ کرتے ہیں۔ ہمارے مرزا صاحب کا ثانی الذّکر (بیمار برادری) سے کتنا دیرینہ تعلق ہے، اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ بیس برس پہلے آئی۔سی۔ایس کے مُقابلے کے امتحان میں اوّل آنے کے بعد اُن کا ڈاکٹری معائنہ ہُوا تو پتہ چلا کہ دانتوں کے علاوہ اور کوئی چیز ٹھیک نہیں۔ گو کہ برادری کے رُکن کی حیثیّت سے ہم خُود بھی اپنی صحّت کی طرف سے ایک لحظہ غافل نہیں، تاہم ابھی یہ نوبت نہیں آئی کہ وٹامن کی گولی حلق سے اُترتے ہی اپنے بازو کی مچھلیاں پُھلا پُھلا کر دیکھنے لگیں۔ لیکن مرزا کا یہ روزمرّہ کا معمول سا ہو گیا کہ دوائیں ہضم کرنے کے لیے شام کو مانگے تانگے کی چھڑی گھماتے ہُوئے نکل جاتے۔ دستانوں کی طرح یہ سڈول چھڑی بھی پروفیسر کے دوست پیرس سے لائے تھے۔ اس

پر فرنچ ایکٹرس برژیت باردو کی ٹانگ کا بالائی حصّہ بطور دستہ لگا ہوا تھا۔ اسی کے سہارے پروفیسر نے وہ ٹیلا "فتح" کیا، جس کی سرکوبی کا مفصّل حال پہلے آچکا ہے۔ اسی کے ذریعے وہ اندھیری راتوں میں اپنے اور گستاخ کتّوں کے درمیان ایک باوقار فاصلہ قائم رکھتے ہیں اور اب اسی کو ہلاتے سہلاتے ہوئے مرزا جناح روڈ کی ہر تیسری دُکان میں (جو دواؤں کی ہوتی تھی) درّانہ گھستے چلے جاتے۔ کاؤنٹر کے پاس استادہ مشین میں کھوٹی اکنّی ڈال کر اپنا وزن لیتے اور اونس دو اونس کے اضافے پر مقامی آب وہوا کی شان میں قصیدے پڑھتے لوٹتے۔ ایک دن ہم نے کہا، دیکھو، دواؤں کی یہ دُکان کتنی چلتی ہے۔ صبح سے رات گئے تک خوش پوش خواتین کا تانتا بندھا رہتا ہے، مگر تمھیں یہاں تُلتے کبھی نہیں دیکھا۔ کہنے لگے، توبہ کیجیے صاحب! معلوم ہوتا ہے اس کی مشین خاص طور پر عورتوں کے لیے بنوائی گئی ہے۔ ایک دن تُلا تو کُل چالیس پونڈ اُترا۔ دھک سے رہ گیا۔ سیٹھ سے جا کر شکایت کی "یہ کیا زیادتی ہے؟" خدا کی قسم کھا کے بولا "آپ کے ساتھ دشمنی تھوڑا ہی ہے۔ سبھی کو پچاس پونڈ کم بتاتی ہے"! اس کے بعد اُس بے ایمان نے کھوٹی اکنّیوں کی ڈھیری میں سے مرزا کو ایک اکنّی واپس کرنی چاہی، جسے انھوں نے ازراہِ اخلاق قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

بھلا مرزا ایسی دُکان میں جا کر سیروں بلکہ منوں مایوسیاں کیوں مول لینے لگے وہ تو ان صحت پسندوں میں سے ہیں، جو ٹہلنے نکلیں تو قدموں کی گنتی رکھتے ہیں اور مقوی لُقمہ لینے سے پہلے اس خون کے ایک ایک قطرے کا حساب لگا لیتے ہیں، جو اس سے بننا چاہیے ـــــ مگر نہیں بنتا! اُن کے تغذیاتی پیمانے کی رُو سے کالے ہرن کی کلیجی میں ایک سالم اُونٹ کی غذائیت ہوتی ہے۔ اور ایک پہاڑی چکور میں ہرن کے برابر۔ لیکن

کوئٹہ کی ایک خوبانی پورے تین چکوروں کے برابر ہوتی ہے وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ ایک دن اپنے حسابوں ڈیڑھ دو درجن سالم اونٹ درخت سے توڑ کر کچر کچر کھائے اور جھومتے جھامتے ہمارے پاس آئے۔ کہنے لگے، صاحب! یہ شہر تو اس قدر پُرفضا ہے کہ کھا کھا کے اپنا تو دوالہ نکلا جا رہا ہے۔ کھانا حلق سے اترا نہیں کہ ہضم۔ ہم نے کہا، اس سے فائدہ؟ بولے، دیکھتے نہیں؟ ٹورسٹ بی بیاں بے کاری سے بچنے کے لیے دن بھر جو سوئٹر سٹاسٹ بُنتی رہتی ہیں، وہ تیار ہونے سے پہلے تنگ ہو جاتے ہیں۔ شام کو چائے اور چلغوزے کے ساتھ غیبت بڑا مزا دیتی ہے۔ پھر ہر چیز ارزاں، ہر چیز خالص۔ حد یہ کہ "اسکنڈل" میں بھی جھوٹ کی ملاوٹ نہیں۔ کراچی میں خالص دودھ تو بڑی بات ہے، پانی بھی خالص نہیں ملتا۔ اس میں بھی دودھ کی آمیزش ہوتی ہے۔ مگر یہاں دکاندار عادۃً سچ بولتے اور سستا بیچتے ہیں۔ اسی لیے بعضے ٹورسٹ سمجھتے ہیں کہ چھوٹا شہر ہے

پھر وہ کوئٹہ کی فوقیت یکے بعد دیگرے دنیا کے دوسرے شہروں پر ثابت کرنے لگے:

"لاہور؟"

"کیلنڈر سے اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، ستمبر کے مہینے ہمیشہ کے لیے خارج کر دیے جائیں، تو واللہ! لاہور کا جواب نہیں!"

"روم؟"

"ایک حسین قبرستان! زمین کے نیچے کی آبادی، اوپر کی آبادی سے کہیں زیادہ ہے۔ رہے تاریخی کھنڈر، سو اُن میں چمگادڑیں اور امریکی ٹورسٹ بسیرا کرتے ہیں۔ جیمس جوائس نے جھوٹ نہیں کہا تھا کہ روم کی مثال ایک ایسے شخص کی سی ہے جو

اپنی نانی کی لاش کی نمائش کر کے روزی کماتا ہے۔"

"مری، ملکۂ کوہسار مری؟"

"صاحب! جلوہ گری میں کوئٹہ سے کم نہیں ؏

وہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں"

"اور دلّی؟"

"شہر بُرا نہیں۔ مگر غلط ملک میں آباد ہے۔"

"جنیوا، صحّت گاہِ عالم؟"

"صاحب! مرنے کے لیے اس سے زیادہ پُرفضا مقام روئے زمین پر نہیں۔"

"کراچی کے متعلق کیا رائے ہے حضور کی؟"

"بہت اچھی! اگر آپ سر کے بل کھڑے ہو کر دیکھیں تو کراچی کی ہر چیز سیدھی نظر آئے گی۔"

"یار! تم کراچی کے ساتھ صریحاً زیادتی کرتے ہو۔"

"ہرگز نہیں! میں کراچی کے حقوق کے لیے ہمیشہ لڑتا رہوں گا۔ اسی لیے میں اہالیانِ کراچی کے اس مطالبے کی شد و مد سے حمایت کرتا ہوں کہ ملیر کے پُل اور سڑک کی مرمّت ہونی چاہیے۔ ضرور ہونی چاہیے اور جلد ہونی چاہیے تاکہ کراچی سے نکلنے میں آسانی رہے۔"

"یہی بات ہے تو تم واپس کیوں جا رہے ہو؟"

"مگر (انگشتِ شہادت اٹھاتے ہوئے) ایک بات ہے۔ کراچی والے آگے

ہو کر کراچی کی بُرائی کرتے ہیں، لیکن کوئی اور اُن کی ہاں میں ہاں ملا دے تو خفا ہو جاتے ہیں۔ بس اِسی ادا پہ پیار آتا ہے۔"

پھر کوئٹہ کی برتری ثابت کرتے کرتے بے دھیانی میں کہنے لگے "ہائے! یہ عظیم شہر اگر کراچی میں ہوتا تو کیا بات تھی!"

مرزا نے اتنا کہا اور دایاں ہاتھ پھیلا کر اپنا سینہ پُھلایا اور پھر اوّل الذّکر کو آخر الذّکر پر مارا۔ ایک آہِ سرد کھینچی اور خاموش ہو گئے۔

اُن کے رُخساروں پر خُونِ صالح کے وہ چند قطرے چمک رہے تھے، جنھیں آتشِ روزگار نے بہت جلد خشک کر دیا۔

(اپریل ۱۹۶۳ء)